حقوق الزوجین

(۴)

قضاء شرعی/ طلاق اور خلع کی بحث میں قانون اسلامی کی جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں ان سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ یہ قانون اس قاعدۂ کلیہ پر وضع کیا گیا ہے کہ عورت اور مرد کا زدواجی تعلق اگر قائم رہے تو حدود اللہ کی حفاظت اور مودت و رحمت کے ساتھ قائم رہے جس کو قرآن میں امساک بالمعروف کے جامع لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، اور اگر اس طرح ان کا باہم مل کر رہنا ممکن نہ ہو تو تسریح باحسان ہونا چاہیے یعنی جو میاں بیوی بھلی طرح مل کر نہ رہ سکتے ہوں وہ سیدھی طرح الگ ہوجائیں اور ایسی صورتیں پیدا نہ ہونے پائیں کہ ان کے اختلاف سے نہ صرف ان کی اپنی زندگی تلخ ہو بلکہ خاندانوں میں فتنے برپا ہوں، سوسائٹی میں گندگی پھیلے، اخلاقی مفاسد کی اشاعت ہو اور آیندہ نسلوں تک ان سے برے اثرات منتقل ہوجائیں۔ انہی خرابیوں کا سدباب کرنے کے لیے شریعت نے مرد کو طلاق کا اور عورت کو خلع کا حق دیا ہے تاکہ اگر وہ چاہیں تو خود تسریح باحسان کے اصول پر عمل کرسکیں لیکن بہت سی ایسی جھگڑالو طبیعتیں بھی ہوتی ہیں جو نہ امساک بالمعروف پر عمل کرسکتی ہیں اور نہ تسریح باحسان پر آمادہ ہوتی ہیں نیز ازدواجی معاشرت میں ایسی صورتیں بھی پیش آجاتی ہیں جن میں زوجین کے درمیان یا تو حقوق کے باب میں اختلاف واقع ہوتا ہے یا امساک بالمعروف اور تسریح باحسان دونوں پر عمل کرنا ان کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ اس لیے شریعت نے طلاق اور خلع کے علاوہ ایک تیسرا طریقہ بھی حقوق کے تصفیہ اور حدود کی حفاظت کے لئے مقرر کردیا ہے جس کا نام قضاء شرعی ہے۔

قبل اس کے کہ ان مسائل کو بیان کیا جائے جو قضاء شرعی سے تعلق رکھتے ہیں چند اصولی مباحث کی توضیح ضروری ہے۔

قضاء کے لیے اولین شرط قضاء شرعی کی جو شرائط تفصیل کے ساتھ کتب فقہ میں مذکور ہیں، ان میں سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ قاضی لازماً مسلمان ہونا چاہیے۔ اس کی ایک وجہ تو وہی ہے جس کو فقہا نے بتصریح بیان کیا ہے، یعنی یہ کہ اصول شرع کے تحت شرعی مسائل میں مسلمانوں پر غیر مسلم حاکم کا حکم خواہ ظاہراً نافذ ہو جائے مگر باطناً نافذ نہیں ہو سکتا۔ مثلاً اگر ایک غیر مسلم حاکم ایک مسلمان کا نکاح فسخ کرے تو خواہ اس کا یہ حکم احکام شرع کے مطابق ہی کیوں نہ ہو اور زوجین میں عملاً تفریق ہی کیوں نہ ہو جائے لیکن درحقیقت نہ اس کے فسخ کرنے سے نکاح فسخ ہوگا اور نہ شرعاً عورت کے لیے دوسرے شخص سے نکاح کرنا جائز ہوگا۔ اگر وہ نکاح کرے گی تو اس کا نکاح باطل ہوگا اور اسلامی شریعت کی نگاہ میں اس کی اولاد ناجائز ہوگی۔ ممکن ہے کہ اس وجہ کو آج کل کی ذہنیتیں محض وہمی (Sentimental) قرار دے کر رد کر دیں لیکن اگر مسلمانوں کا یہ حق تسلیم کیا گیا ہے کہ ان کے شخصی معاملات خود انہی کے شخصی قانون (Personal law) کے مطابق طے کیے جائیں گے تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کے شخصی قانون کے قواعد میں سے ایک اہم قاعدہ کو غیر اسلامی قانون کے نظریات کی بنا پر ساقط کر دیا جائے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ جن مسائل کا تصفیہ قاضی کے فیصلہ پر چھوڑا گیا ہے ان کے لیے اگرچہ شریعت میں مفصل قوانین موجود ہیں لیکن شخصی معاملات میں ہر مقدمہ کے مخصوص حالات کو پیش نظر رکھ کر ان قوانین کی صحیح تعبیر و تنفیذ اور اصول قانون سے حسب موقع جزئیات کا استنباط، اور روح قانون کے مطابق فصل خصومات کے جملہ شرائط کا لحاظ، بغیر اس کے ممکن نہیں کہ قاضی میں قوت اجتہاد اور اس کے ساتھ اعتقاداً اس قانون کا احترام بھی موجود ہو جس کو نافذ کرنے کے لیے وہ منصب قضاء پر مامور ہوا ہے، اور یہ دونوں باتیں اسی شخص میں متحقق ہو سکتی ہیں جو مذہباً مسلمان ہو، اسلامی قانون کے اصول و فروع پر حاوی ہو، اس کی سپرٹ کو اچھی طرح سمجھتا ہو۔ اس کے اصل مآخذ پر دسترس رکھتا ہو، اور مسلم سوسائٹی کے نظام ترکیبی سے اندرونی طور پر بھی واقف ہو۔ ایک غیر مسلم جج میں ان صفات کا پایا جانا کسی طرح ممکن نہیں اور اس وجہ سے یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ مسلمانوں کے شرعی قضایا کا صحیح فیصلہ کر سکے گا۔

ہندوستان میں قضاء شرعی نہ ہونے کے نقصانات

ہندوستان میں انگریزی حکومت قائم ہونے کے بعد بھی ۱۸۶۴ء تک مسلمانوں کے شرعی معاملات کا تصفیہ مسلمان قاضی ہی کرتے تھے جن کا انتخاب علماء کے گروہ میں سے کیا جاتا تھا۔ لیکن اس کے بعد منصب قضاء منسوخ کر دیا گیا، اور عام دیوانی معاملات کی طرح شرعی معاملات بھی انگریزی عدالتوں کے حدود و اختیار میں داخل کر دیے گئے۔ اس کا پہلا نقصان تو یہ ہوا کہ اصول شریعت کے مطابق جس چیز پر "قضائے شرعی" کا اطلاق ہوتا ہے وہ قریب قریب بالکلیہ مفقود ہو گئی، اور مسلمانوں کے لیے اپنے شرعی معاملات میں ان عدالتوں سے ایسا فیصلہ حاصل کرنا غیر ممکن ہو گیا جو ان کے مذہب کی رو سے جائز شرعی فیصلہ کہا جا سکتا ہو۔ دوسرا نقصان (جو اہمیت میں پہلے نقصان سے کسی طرح کم نہیں) یہ ہے کہ ان عدالتوں کے پاس نہ وہ ذرائع ہیں جن سے وہ قانون اسلامی کے اصول و فروع پر اتنی وسیع نظر بہم پہنچا سکتے ہوں کہ ان میں صحیح قوت اجتہاد پیدا ہو جائے، اور نہ ان کے دل میں اس قانون کا اتنا احترام موجود ہوتا ہے کہ اس کے حدود سے تجاوز کرنے میں ان کو تامل ہو۔ ان کے علم کا مدار جن کتابوں پر ہے وہ ایسے مصنفین کی لکھی ہوئی ہیں جو عربی سے ناواقف تھے قانون کے اصلی ماخذ سے بے بہرہ تھے اور اصطلاحات قانون تک کو سمجھنے کی اہلیت نہ رکھتے تھے، مثلاً ہیملٹن (Hamilton) جس نے ایک فارسی شرح کی مدد سے ہدایہ کا ترجمہ کیا ہے، حالانکہ وہ غریب ہدایہ کو سمجھنے کی قابلیت ہی نہ رکھتا تھا، اور فقہ کی معمولی اصطلاحات میں بھی اس نے اتنی ٹھوکریں کھائیں کہ اکثر مقامات پر اصل ہدایہ کی طرف رجوع کیے بغیر اس کی عبارت سمجھ میں نہیں آسکتی اور بیلی (Baillie) جس کا (Digest of Mohammadan Law) فتاویٰ عالمگیری کے اقتباسات کے ترجمے سے ماخوذ ہے۔ اور میکناٹن (Macnaghton) جس کی کتاب (Principles of Mohammadan Law) ناقص معلومات اور اس پر ناقص فہم و توجیہ کے ساتھ مرتب کی گئی ہے۔ انگریزی عدالتیں خود اپنے دائرۂ

معلومات کی اس تنگی کا اعتراف کرتی ہیں، چنانچہ جسٹس مارکبی[1] ایک مقدمہ کے فیصلہ میں لکھتا ہے:-

"شرع اسلام کو معلوم کرنے کے جو ذرائع عدالت کو حاصل ہیں وہ اس قدر تنگ اور محدود ہیں ..... کہ میں اس سے تعلق رکھنے والے مسائل کے تصفیہ سے بچنے کے ہر طریقہ کو اختیار کرنے پر بخوشی آمادہ ہوں۔"

مگر ایسی محدود معلومات کے ساتھ یہ عدالتیں اسلامی قانون میں اجتہاد کرنے کی جرأت کرتی ہیں اور اس کے حدود سے تجاوز کرنے میں ان کو کوئی تامل نہیں ہوتا کیونکہ نہ اس قانون کا احترام ان کے عقائد میں داخل ہے، اور نہ حکومت سلطہ کے نظام عدلیہ کی طرف سے ان پر کوئی ایسی پابندی عائد کی گئی ہے کہ وہ اس قانون کے حدود سے تجاوز نہ کرسکیں۔ ایک مقدمہ[2] کے فیصلہ میں چیف جسٹس گارتھ نے جو الفاظ لکھے ہیں وہ ان عدالتوں کی صحیح پوزیشن کو نمایاں کرنے کے لیے کافی ہیں۔

"قانون اسلام جس کی طرف ہمیں توجہ دلائی گئی ہے اور جو قدیم کتابوں میں مندرج ہے اب سے صدیوں پہلے بغداد اور دوسرے اسلامی ممالک میں جاری ہوا تھا جن کے قانونی اور تمدنی حالات ہندوستان کے حالات سے بالکل مختلف تھے۔ اگرچہ ہم ایسے مقدمات میں جو مسلمانوں کے درمیان ہوتے ہیں بحتی الامکان احکام شرع اسلامی کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن اول تو یہی معلوم کرنا مشکل ہے کہ دراصل وہ احکام کیا تھے، پھر ان اختلافات میں توفیق دینا بھی مشکل ہے جو اکابر مجتہدین یعنی امام ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ کے درمیان بکثرت پیش آئے ہیں۔ اس لیے امکانی حد تک ہمیں اس صحیح اصول کو دریافت کرنے کی کوشش کرنی چاہیے جس پر کوئی حکم مبنی ہو، اور پھر قواعد انصاف، نیک نیتی اور دوسرے ملکی قوانین اور تمدنی حالات کو پیش نظر رکھ کر اسے نافذ کرنا چاہیے۔"

[1] خواجہ حسین بنام شہزادی ہزاری بیگم۔ [2] ملک عبدالغفور بنام ملکہ۔

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ ایک حاکم عدالت جو اسلامی قوانین سے اپنی ناواقفیت کا معترف ہے اور اختلافات ائمہ میں توفیق دینے کا اپنے آپ کو اہل نہیں سمجھتا، وہ اسلامی قوانین پر اس ناقص علم کے ساتھ اجتہاد سے کام لینے کو علانیہ جائز ٹھیراتا ہے، اور اسے ایک عدالتی فیصلہ میں یہ بات ظاہر کرتے ہوئے کوئی تامل نہیں ہوتا کہ وہ مسلمانوں پر اسلامی قانون کو نافذ کرنے میں صرف اسلامی قانون ہی کے حدود کا پابند نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ دوسرے قوانین ملکی اور تمدنی حالات اور قواعد انصاف کے متعلق خود اپنے نظریات کا لحاظ کرنا بھی اس کے لیے ضروری ہے۔ یہ اسی اجتہاد بلا علم و تقویٰ کا نتیجہ ہے کہ جو ادھورا اور ناقص قانون محمڈن لا کے نام سے ہمارے ملک کی عدالتوں میں داخل ہے اس کا بھی ٹھیک ٹھیک نفاذ ہمارے شرعی معاملات میں نہیں ہوتا اور عدالتی فیصلوں سے اس کی صورت روز بروز مسخ ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اصلاح کی راہ میں پہلا قدم اس معاملات نکاح و طلاق وغیرہ کے متعلق اسلامی قوانین کی توضیحات کرنے اور قانونی وسائل سے ان کو عدالتوں میں رائج کرنے سے پہلے حکومت سے یہ اصول تسلیم کرالینا ضروری ہے کہ مسلمانوں کے شرعی مقدمات کا تصفیہ مسلمان حاکم کے سوا کوئی اور نہیں کر سکتا۔ اگر حکومت مسلمانوں کے لیے قضائے شرعی کے اس پرانے طریقے کو پھر سے زندہ کر دے جو ۱۷۷۳ء سے ۱۸۶۴ء تک برٹش انڈیا میں قائم تھا، اور جس پر اب بھی فلپائن، جاوا، تونس، الجزائر، شام، فلسطین، یوگوسلیویا، پولینڈ، اور دوسرے اسلامی ممالک میں غیر مسلم حکومتیں عامل ہیں، تو اس سے بہتر کوئی بات نہیں، لیکن اگر حکومت کو اس میں تامل ہو تو مسلمانوں کی شرعی مشکلات کو دور کرنے کی دوسری صورت یہ ہے کہ مذہب مالکی کے مطابق ہر ضلع میں تین مسلمانوں کی ایک پنچایت مقرر کی جائے جس کے ارکان پر عموماً اس ضلع کے مسلمانوں کو اعتماد ہو اور جن میں سے کم از کم ایک رکن مستند عالم دین ہو۔ پھر ایک مخصوص قانون کے ذریعہ سے اس پنچایتی نظام کو تسلیم کرایا جائے جس میں اس امر کی تصریح ہو کہ مسلمانوں کے معاملات نکاح و طلاق وغیرہ میں پنچایت کے فیصلوں کی حیثیت عدالتی فیصلوں کی سی ہوگی اور انگریزی عدالتوں میں اس کے خلاف کوئی چارہ جوئی نہ ہو سکے گی

اور خود انگریزی عدالتوں میں بھی جو مقدمات نکاح و طلاق وغیرہ زیر تجویز ہیں یا ہوں گے، ان کو بھی پنچایتوں کی طرف منتقل کر دیا جائے گا۔[1]

برٹش انڈیا کے علاوہ غیر مسلم ریاستوں، اور ان اسلامی ریاستوں میں بھی جنہوں نے انگریزی حکومت کی تقلید میں قضائے شرعی کو موقوف کر کے شرعی معاملات کو عام دیوانی عدالتوں کے دائرۂ سماعت میں داخل کر دیا ہے، اصلاح معاملات کے لیے سب سے پہلے یہی کوشش ہونی چاہیے کہ یا تو قضائے شرعی کا بندوبست کیا جائے، یا پھر پنچایتی سسٹم قائم کر کے اس کو از روئے قانون تسلیم کرایا جائے جب تک یہ نہ ہوگا مجالس وضع قوانین میں کسی مسودۂ قانون کو پیش اور پاس کرا لینا اسلامی اغراض کے لیے ہرگز سود مند نہ ہوگا۔

ایک جدید مجموعہ قوانین کی ضرورت انتظام قضاء شرعی کے ساتھ ایک اور چیز بھی ضروری ہے، اور وہ ایک ایسے کتابچہ کی تدوین ہے جس میں مسلمانوں کے شرعی معاملات کے متعلق فقہی احکام کو دفعات کی شکل میں تشریحات سمیت مرتب کر دیا جائے، تاکہ عدالتوں یا پنچایتوں میں موجودہ انگریزی محمڈن لا کی جگہ اس کو رواج دیا جا سکے۔ مصر میں جب (Mixed Tribunals) قائم کئے گئے تھے تو وہاں بھی ایسے ایک مجموعہ قوانین (Code) کی ضرورت محسوس کی گئی تھی جس میں نہایت مستند ماخذ سے تمام ضروری قوانین یکجا مرتب کر دیے گئے ہوں، چنانچہ حکومت مصر کے ایماء سے قدری پاشا کی صدارت میں علماء ازہر کی مجلس نے اس کام کو انجام دیا، اور اس مجلس کے مرتب کیے ہوئے مجموعہ کو سرکاری طور پر تسلیم کر کے عدالتوں میں رائج کیا گیا[2] ضرورت ہے کہ ہندوستان میں بھی ایک ایسی مجلس مقرر کی جائے جس میں ہر گروہ کے

---

[1] حنفیہ کے نزدیک پنچایت کا فیصلہ قضاء قاضی کا قائم مقام نہیں ہو سکتا لیکن اگر حکومت وقت کی طرف سے ان پنچایتوں کے اختیار سماعت کو تسلیم کر لیا جائے اور انھیں اپنے فیصلوں کو نافذ کرنے کے لیے ضروری اختیارات مل جائیں تو مذہب حنفی کے مطابق بھی ان کے فیصلے قضاء شرعی کے حکم میں ہوں گے۔

[2] اس مجموعہ کا ترجمہ فرنچ زبان میں Droit Mussulman کے نام سے شائع ہو چکا ہے اور مصر کے علاوہ دوسرے اسلامی ممالک کی عدالتوں میں بھی اس سے استفادہ کیا جاتا ہے۔

چند علماء چند ماہرین قانون کے ساتھ مل کر ایک مفصل ضابطہ، ضروری تشریحات کے ساتھ مرتب کریں۔ اس ضابطہ کو ابتداءً ایک مسودہ کی شکل میں شائع کر کے مختلف جماعتوں کے علماء کی رائے دریافت کی جائے پھر ان آراء اور تنقیدات کا مناسب لحاظ کر کے اس پر نظر ثانی کی جائے اور جب ضابطہ اپنی آخری صورت میں مرتب ہو جائے تو مجالس قانون ساز میں ایک ایکٹ کے ذریعہ سے یہ طے کر دیا جائے کہ آئندہ سے مسلمانوں کے شرعی معاملات کے لئے اسی مجموعہ کو محمدن لا کی مستند کتاب قرار دیا جائے گا اور اس کے خلاف کسی عدالت کے سابق نظائر یا محمدن لا کی کسی کتاب کے بیانات قابل اعتبار نہ ہوں گے۔

کہا جا سکتا ہے کہ جب ہماری کتب فقہ میں تمام مسائل تفصیل کے ساتھ موجود ہیں تو ایک نیا مجموعہ مرتب کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ یہ اعتراض صرف ممکن ہی نہیں بلکہ ایک گروہ کی ذہنیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے یقین ہے کہ اس تجویز کی ضرور مخالفت کی جائے گی، اس لیے ہم اختصار کے ساتھ وہ وجوہ بیان کرتے ہیں جن کی بنا پر ہمارے نزدیک یہ کام ضروری ہے۔

یہ بات تو سرسری نظر میں ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ فقہ کی کتابوں میں مسائل منتشر ہیں، قدیم طرز بیان و انداز ترتیب پر لکھے ہوئے ہیں، اور ایسی زبان میں ہیں جس سے اس ملک کے قانون پیشہ اصحاب اور حکام عدالت عموماً واقف نہیں ہیں۔ آج کل کے لوگوں کو نہ اتنی فرصت کہ کسی مسئلہ کی تحقیق کے لیے مبسوطات کی طرف مراجعت کر سکیں، نہ اتنی استعداد کہ ان کو سمجھ سکیں۔ ایسی حالت میں جب کوئی پیچیدہ مقدمہ ان کے سامنے پیش ہوتا ہے تو وہ مجبور ہوتے ہیں کہ علماء سے فتویٰ لیں۔ فتویٰ کی صحت کا مدار اس پر ہے کہ مفتی کے سامنے مقدمہ کی پوری روداد ہو اور وہ تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر شرعی حکم بیان کرے۔ لیکن بہت کم معاملات میں اس طرح فتوے حاصل کئے جاتے ہیں۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ ہر فریق کے وکلاء صورت مقدمہ کو اپنی اغراض کے مطابق ڈھال کر مفتی کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اور مفید مطلب فتویٰ حاصل کر کے عدالتوں کے سامنے لے جاتے ہیں جن سے درحقیقت اغراض انصاف کے لیے کوئی رہنمائی نہیں ہو سکتی

ان خرابیوں کا علاج ایک مستند مجموعہ قوانین کے بغیر کسی طرح ممکن نہیں۔

لیکن اس سے زیادہ اہم وجہ یہ ہے کہ قدیم فقہی کتابوں میں جتنے احکام بیان کیے گئے ہیں ان میں زیادہ تر عام انسانی حالات کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ان احکام کو لفظ بلفظ لے کر ہر جگہ ہر معاملہ پر بے تکلف جاری کر دینا اصلاً غلط ہے۔ ان کی صحیح تنفید موقوف ہے اس پر کہ:

اولاً جس اسلامی جماعت میں ان کو نافذ کیا جا رہا ہے اس کی اخلاقی، تمدنی، معاشرتی اور معاشی حالات کو پیش نظر رکھا جائے، یہ بھی دیکھا جائے کہ ان کے اجتماعی عادات وخصائل اور رسم ورواج کس قسم کے ہیں وہ کس ماحول میں رہتے ہیں! اس ماحول کے ان پر کیا اثرات ہیں ان کی سیرت اور ان کے معاملات میں اسلام کا اثر کس قدر قوی یا ضعیف ہے، بیرونی اثرات سے ان کے اسلامی خصائص میں کس قدر فرق واقع ہوا ہے اور عام تمدنی حالات سے معاملات کی فقہی حیثیت میں کیا تغیرات رونما ہوئے ہیں۔

ثانیاً ہر مقدمہ کے مخصوص انفرادی حالات پر نظر رکھی جائے، فریقین کی سیرت، عمر، تعلیم، جسمانی حالات، معاشی وتمدنی حیثیت، گذشتہ تاریخ، خاندانی روایات اور ان کے طبقہ کی عام حالت سب پر نگاہ ڈال کر رائے قائم کی جائے کہ ایک خاص جزئی معاملہ میں ان پر قانون کا نفاذ کس طریقہ سے کیا جائے جس سے قانون کا مقصد بھی ٹھیک ٹھیک پورا ہو جائے، اور اصول قانون سے انحراف بھی نہ ہونے پائے۔

ان دونوں پہلوؤں کو نظر انداز کر کے اگر کوئی شخص فقہ کی کسی پرانی کتاب میں سے ایک جزئیہ نکالے اور آنکھیں بند کر کے اس کو ہر اس مقدمہ میں جو اس جزئیہ سے تعلق رکھتا ہو چسپاں کرتا چلا جائے تو اس کی مثال اس طبیب کی سی ہوگی جو بقراط اور جالینوس کے نسخے لے کر بیٹھ جائے، اور ملک کی آب وہوا، موسم، مریضوں کے مزاج، اور امراض کی جداگانہ کیفیتوں سے آنکھیں بند کر کے ان نسخوں کو برتنا شروع کر دے۔ حکمائے قدیم کے مرتب کیے ہوئے نسخے اپنی جگہ نہایت صحیح اور حکیمانہ سہی، مگر وہ

اس لیے کب مرتب کیے گئے تھے کہ جاہل عطار ان کو برتیں؟ انہیں استعمال کرنے کے لیے بھی علم، تجربہ، حکمت اور سوجھ بوجھ کی ضرورت ہے۔ بالکل اسی طرح ائمۂ مجتہدین نے شریعت کے قواعد اور اساسی احکام سے جو جزئی مسائل مستنبط کئے ہیں وہ اپنی جگہ نہایت درست سہی لیکن یہ بات تو ان بزرگوں کے حاشیہ خیال میں بھی نہ ہوگی کہ ان اجتہادی احکام کو تفقّہ اور تدبّر کے بغیر اس طرح استعمال کیا جائے گا جیسے ڈاک خانہ کی مہر کو ایک جاہل چپراسی ہر لفافہ پر لگاتا چلا جاتا ہے۔

قانون اسلام ایسے حکیمانہ اصول پر بنایا گیا تھا کہ اس کے ماتحت کسی فرد یا عورت کا مجبوراً بداخلاقی میں مبتلا ہونا، یا سوسائٹی میں موجب فتنہ وفساد بن جانا قریب قریب محال تھا، اور یہ تو بالکل ہی ناممکن تھا کہ اس قانون کی کسی سختی سے مجبور ہو کر کوئی مسلمان عورت یا مرد دائرۂ اسلام سے نکل جائے لیکن آج ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں میں نہ صرف بے شمار خاندانی جھگڑے بلکہ سخت اخلاقی مفاسد حتی کہ ارتداد تک کے واقعات محض اس وجہ سے رونما ہو رہے ہیں کہ اکثر معاملات میں قانون اسلام کے تحت لوگوں کے لیے صحیح اور عادلانہ فیصلہ حاصل کرنا محال ہو گیا ہے۔ تفقہ اور تدبر نہ مفتیوں میں ہے نہ حکام عدالت میں۔ ان میں سے کوئی بھی یہ نہیں دیکھتا کہ ہم ایک عام حکم کو جس ملک جس سوسائٹی اور جس خاص مقدمہ میں نافذ کر رہے ہیں اس کی کون کونسی خصوصیات کو ملحوظ رکھکر اس حکم کے عموم میں اصول شریعت کے ماتحت تخصیص کرنے کی ضرورت ہے تاکہ شریعت کے مقاصد میں سے کوئی مقصد فوت نہ ہونے پائے اور اصول میں کسی اصل کی خلاف ورزی لازم نہ آئے۔ جہاں تک حکام عدالت کا تعلق ہے ان کی معذوری تو ظاہر ہے، رہے علما، تو ان میں سے بعض تو اس سے زیادہ کی استعداد ہی نہیں رکھتے کہ قدیم کتب فقہ میں جو جزئیات جس عبارت کے ساتھ لکھے ہوئے ہیں ان کو ٹھیک ٹھیک اسی عبارت کے ساتھ نکال کر پیش کر دیا کریں، اور بعض کو اگرچہ اللہ تعالیٰ نے وسعت نظر اور تفقہ فی الدین سے سرفراز کیا ہے، لیکن فرداً فرداً ان میں سے کسی میں اتنی جرأت نہیں کہ کسی مسئلہ میں تفقہ سے کام لے کر کسی قدیم

جزئیہ کی عبارت سے یک سرِ مو بھی انحراف کر جائیں، کیونکہ ایک طرف خود انھیں اپنے مبتلائے غلط ہونے کا خوف اس جرات سے باز رکھتا ہے اور دوسری طرف یہ خوف دامنگیر ہوتا ہے کہ دوسرے علما کی طرف سے ان پر غیر مقلدیت کا الزام لگا دیا جائے گا۔ اس کا علاج بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ ہر صوبہ کے جلیل القدر اور با اثر علما کی ایک جماعت اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے اور اجتماعی قوت و اثر سے کام لے کر شرعی معاملات کے لیے ایسا ضابطہ بنائے جو مسلمانانِ ہند کی موجودہ اخلاقی تمدنی اور معاشی حالت سے مناسبت رکھتا ہو اور جس میں اتنی لچک بھی ہو کہ مخصوص انفرادی حالات میں اصول کے تحت جزئی احکام کے اندر مناسب تغیر کیا جا سکے۔

اگر کوئی شخص اس طریقہ کو "غیر مقلدیت" قرار دیتا ہے تو ہم کہیں گے کہ وہ غلطی پر ہے، وہ نہیں سمجھتا کہ ائمہ مجتہدین کی تقلید اور انبیا کی تقلید میں کیا فرق ہونا چاہیے۔ وہ نہیں جانتا کہ جاہل کی تقلید اور عالمِ محقق کی تقلید میں کیا فرق ہونا چاہیے۔ اسے اتنا وقوف بھی نہیں کہ کسی مذہبِ فقہی کا اتباع کرنے کے معنی کیا ہیں۔ اس نے تقلید کے معنی یہ سمجھے ہیں کہ اپنے مذہبِ فقہی کو بمنزلۂ دین، اور اس مذہب کے امام کو بمنزلۂ نبی، اور اس کے مسائل کو نصوصِ کتاب اللہ کی طرح اٹل سمجھا جائے، اور یہ بات عقیدہ کے طور پر دل میں بٹھالی جائے کہ اس مذہب کے کسی مسئلہ میں اصلاح ترمیم اور اضافہ تو درکنار اس پر تحقیق اور تنقید کی نظر ڈالنا بھی گناہِ عظیم ہے اور کسی مسئلہ میں اس مذہب کے کسی جزئیہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے مذہبِ فقہی سے کوئی جزئیہ اخذ کرنا زمانۂ اجتہاد یعنی چوتھی صدی ہجری تک تو حلال تھا مگر اس کے بعد حرام ہو گیا لیکن اس طرح کی تقلید علمائے سلف میں سے کسی سے بھی ثابت نہیں، اور نہ اس کے لیے کوئی شرعی ثبوت کہیں سے مل سکتا ہے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ کے تلامذہ نے سینکڑوں مسائل میں اپنے امام سے اختلاف کیا اور اس کے باوجود وہ حنفیت سے خارج نہ ہوئے علمائے احناف نے امام اعظم اور ان کے تلامذہ کے اختلافات میں سے بعض کو بعض پر ترجیح دی اور بعض کو ترک کر کے بعض کو مفتیٰ بہ قرار دیا مگر اس تحقیق و تنقید کے باوجود کوئی ان کو

غیر مقلد نہیں کہہ سکتا۔ چوتھی صدی ہجری سے لیکر آٹھویں اور نویں صدی تک کے علمائے احناف متقدین کے اجتہادی مسائل میں ضروریات زمانہ کے لحاظ سے تغیر و تبدل کرتے رہے اور جب ضرورت دوسرے ائمۂ مجتہدین کے دوسرے مذاہب سے مسائل اخذ کرکے ان کے مطابق فتوے دیتے رہے مگر کسی نے اس اجتہاد پر غیر مقلدیت کا حکم نہیں لگایا کسی میں یہ جرأت نہیں کہ ابو اللیث سمرقندی شمس الائمہ سرخسی، صاحب ہدایہ، قاضی خان، صاحب کنز، علامہ شامی اور ایسے ہی دوسرے علماء کو محض اس بناء پر غیر مقلد کہدے کہ انھوں نے مذہب حنفی کے مسائل میں اپنے زمانے کے حالات وضروریات کے لحاظ سے تحریک پیدا کی اور جن معاملات میں اس مذہب کے بعض احکام کو موجب ضرر یا عام حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ناقابل عمل پایا ان میں دوسرے مذاہب فقیہہ کے مطابق فتوی دیا، اور اس بات کو مذہب حنفی کے اصول میں داخل کرلیا کہ بوقت ضرورت مذہب غیر پر حکم اور فتوی دینا جائز ہے بشرطیکہ اس میں اتباع ہوا نہ ہو۔

اس میں شک نہیں کہ اگر لوگ بطور خود اپنی ضرورتوں کے مواقع پر دوسرے مذاہب کے مطابق عمل کرنے یا خود اپنے مذہب کی رخصتوں سے فائدہ اٹھانے میں آزادی برتیں تو اندیشہ ہے کہ اس سے اتباع ہوا اور تلفیق خارق اجماع اور تتبع رخص مذاہب اور تلاعب بالدین کا دروازہ کھل جائے گا اور معاملات میں سخت ابتری پیدا ہو گی لیکن اگر علمائے دین تقوی اور نیک نیتی کے ساتھ باہم مشورہ کرکے مسلمانوں کی ضروریات اور حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ایسا کریں، تو اس میں کسی دینی یا دنیوی نقصان کا اندیشہ نہیں بلکہ اگر کسی مسئلہ میں نادانستہ ان سے غلطی بھی ہو تو نصوص صریحہ اس پر دلالت کرتی ہیں کہ حق تعالی ان کو معاف فرمائے گا اور ان کی نیک نیتی کا ان کو اجر دے گا۔ اس راستہ کو اختیار کرنے میں تو زیادہ سے زیادہ اتنا ہی خطرہ ہے کہ ایک جماعت ان کی مخالفت پر کمربستہ ہو گی اور ان کے متبعین میں سے بھی ایک گروہ ان سے بدظن ہو جائے گا لیکن اس سے بڑا خطرہ اس راستہ کو

اختیار نہ کرنے میں ہے اور وہ یہ ہے کہ جب مسلمان اپنی ضرورتوں سے تنگ آکر قانون اسلامی کے بجائے ہوائے نفس کا اتباع کریں گے اور ان میں تلاعب بالدین اور حدود اللہ کی خلاف ورزی اور دین و اخلاق کی خرابی، اور کفر و معصیت کی وبائیں پھیلینگی اور عیسائی قوموں کی طرح وہ بھی اپنے مذہب کے قانون کو چھوڑ کر انسانی قوانین کو اختیار کریں گے، تو قیامت کے روز حق تعالیٰ کے سامنے ان گنہگاروں کے ساتھ ساتھ ان کے دینی پیشوا بھی پکڑے ہوئے آئیں گے اور اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا کہ کیا ہم نے تم کو علم و عقل سے اسی لیے سرفراز کیا تھا کہ تم اس سے کام نہ لو؟ کیا ہماری کتاب اور ہمارے نبی کی سنت تمہارے پاس اسی لیے تھی کہ تم اس کو لیے بیٹھے رہو اور مسلمان گمراہی میں مبتلا ہوتے رہیں؟ ہم نے اپنے دین کو یسر بنایا تھا تم کو کیا حق تھا کہ اسے عسر بنا دو؟ ہم نے تم کو قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا حکم دیا تھا، تم پر یہ کس نے فرض کیا کہ ان دونوں سے بڑھ کر اپنے اسلاف کی پیروی کرو؟ ہم نے ہر مشکل کا علاج قرآن میں رکھا تھا تم سے یہ کس نے کہا کہ قرآن کو ہاتھ نہ لگاؤ اور اپنے لیے انسانوں کی لکھی ہوی کتابوں کو کافی سمجھو؟ اس باز پرس کے جواب میں امید نہیں کہ کسی عالم دین کو کنز الدقائق اور ہدایہ اور عالمگیری کے مصنفین کے دامنوں میں پناہ مل سکے گی۔ البتہ جہلاء کو یہ جوابدہی کرنے کا موقع ضرور مل جائے گا کہ رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلَا رَبَّنَا آتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيرًا۔

یہ ضمنی بحثیں چونکہ ضروری اور اہم تھیں اور ان کا تفصیلی بیان ناگزیر تھا اس لیے ان کو اتنی جگہ دینی پڑی اس کے بعد ہم اپنے اصل بحث کی طرف رجوع کریں گے۔

(باقی)۔